فصل سوم

قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت

(۲)

یہ اعتراض کہ سارا قرآن بیک وقت کیوں نہ نازل ہو گیا؟ جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے، اگرچہ اس سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہی تھی، مگر کفارِ قریش اُس کو انسانی کلام قرار دینے کے لیے بار بار جس بات کا سہارا لیتے تھے وہ یہ تھی کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل کر دیا جاتا۔ اس کا وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے سوچ سوچ کر تصنیف کیا جا رہا ہے۔ قرآن میں اُن کے اس اعتراض کو نقل کر کے، یا اس کی طرف اشارہ کر کے بڑے دل نشیں انداز میں ان کو بتایا گیا کہ یہ بتدریج کیوں نازل کیا جا رہا ہے اور اس تدریج کی حکمت کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا

(الفرقان - ۳۲-۳۳)

منکرین کہتے ہیں "اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اُتار دیا گیا"؟ — ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اے نبیؐ، اِس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور اِسی غرض کے لیے، ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزا کی شکل دی ہے۔ اور اس میں یہ مصلحت بھی ہے، کہ جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے، اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔

یہ کفارِ مکہ کا بڑا دل پسند اعتراض تھا جسے وہ اپنے نزدیک نہایت زوردار اعتراض سمجھ کر بار بار دہراتے

تھے، مگر قرآن میں اس کے مدلل جوابات دے کر اس کا بھی پوری طرح قلع قمع کر دیا گیا۔ اُن کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ شخص خود سوچ سوچ کر، یا کسی سے پوچھ پوچھ کر اور کتابوں سے نقل کر کر کے یہ مضامین نہیں لا رہا ہے، بلکہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے تو پوری اکٹھی ایک ہی وقت کیوں نہیں آجاتی؟ خدا تو جانتا ہے کہ پوری بات کیا ہے جو وہ فرمانا چاہتا ہے۔ وہ نازل کرنے والا ہوتا تو سب کچھ بیک وقت فرما دیتا۔ یہ جو سوچ سوچ کر کبھی کچھ مضمون لایا جاتا ہے اور کبھی کچھ، یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ وحی اُوپر سے نہیں آتی، یہیں کہیں سے حاصل کی جاتی ہے، یا خود گھڑ گھڑ کر لائی جاتی ہے۔

اِس کے جواب میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی بہت سی حکمتیں بیان کر دی گئی ہیں:

(۱) ایسا اس لیے کیا جا رہا ہے کہ وہ لفظ بلفظ حافظہ میں محفوظ ہو سکے، کیونکہ اس کی تبلیغ و اشاعت تحریری صورت میں نہیں بلکہ ایک اَن پڑھ نبی کے ذریعہ سے اَن پڑھ سامعین کے سامنے زبانی تقریر کی شکل میں ہو رہی ہے۔

(۲) تاکہ اُس کی تعلیمات اچھی طرح ذہن نشین ہو سکیں۔ اِس غرض کے لیے ٹھہر ٹھہر کر تھوڑی تھوڑی بات کہنا اور ایک ہی بات کو مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے بیان کرنا زیادہ مفید ہے۔

(۳) تاکہ اُس کے بتائے ہوئے طریقِ زندگی پر دل جمتا جائے۔ اس غرض کے لیے احکام و ہدایات کا بتدریج نازل کرنا زیادہ مبنی بر حکمت ہے، ورنہ اگر سارا قانون اور پورا نظامِ حیات بیک وقت بیان کر کے اُسے قائم کرنے کا حکم دے دیا جائے تو ہوش پراگندہ ہو جائیں۔ علاوہ بریں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر حکم اگر مناسب موقع پر دیا جائے تو اس کی حکمت اور رُوح زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے بہ نسبت اس کے کہ تمام احکام دفعہ وار مرتب کر کے بیک وقت دے دیے جائیں۔

(۴) تاکہ تحریک اسلامی کے دَوران میں، جبکہ حق اور باطل کی مسلسل کشمکش چل رہی ہو، نبی اور اُس کے پیروؤں کی ہمت بندھائی جاتی رہے۔ اِس لیے خدا کی طرف سے بار بار، وقتاً فوقتاً، موقع بموقع پیغام آنا زیادہ کارگر ہے بہ نسبت اس کے کہ بس ایک دفعہ ایک لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر اُنہیں عمر بھر کے لیے دُنیا بھر کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت میں آدمی محسوس کرتا ہے کہ جس خدا نے اُسے اس کام پر مامور کیا ہے وہ اس کی طرف متوجہ ہے، اس کے کام سے دلچسپی لے رہا ہے، اس کے حالات پر نگاہ رکھتا ہے، اس کی مشکلات میں رہنمائی کر رہا ہے، اور ہر ضرورت کے موقع پر اُسے شرفِ باریابی و مخاطبت عطا فرما کر اس کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہ چیز حوصلہ بڑھانے والی اور عزم کو مضبوط رکھنے والی ہے۔ دوسری صورت میں آدمی کو یوں محسوس

ہوتا ہے کہ بس وہ ہے اور طوفان کی موجیں۔

آخر میں نزولِ قرآن میں تدریج کا طریقہ اختیار کرنے کی ایک اور حکمت بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی شانِ نزول یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ "ہدایت" کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتا ہے اور اس کی اشاعت کے لیے اس نے نبی کو ایجنٹ بنایا ہے۔ بات اگر یہ ہوتی تو یہ مطالبہ بجا ہوتا کہ پوری کتاب تصنیف کر کے بیک وقت ایجنٹ کے حوالے کر دی جائے۔ لیکن دراصل اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور جاہلیت اور فسق کے مقابلے میں ایمان و اسلام اور اطاعت و تقویٰ کی ایک تحریک برپا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے ایک نبی کو داعی و قائد بنا کر اُٹھایا ہے۔ اس تحریک کے دوران میں اگر ایک طرف قائد اور اُس کے پیروؤں کو حسبِ ضرورت تعلیم اور ہدایات دینا اس نے اپنے ذمہ لیا ہے تو دوسری طرف یہ کام بھی اپنے ہی ذمہ رکھا ہے کہ مخالفین جب کبھی کوئی اعتراض یا شبہہ یا اُلجھن پیش کریں اُسے وہ صاف کر دے، اور جب بھی وہ کسی بات کو غلط معنی پہنائیں، وہ اس کی صحیح تشریح و تفسیر کر دے۔ اِن مختلف ضروریات کے لیے جو تقریریں اللہ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہیں ان کے مجموعے کا نام قرآن ہے اور یہ کتابِ آئین یا کتابِ اخلاق و فلسفہ نہیں بلکہ کتابِ تحریک ہے، جس کے مَعرضِ وجود میں آنے کی صحیح فطری صورت یہی ہے کہ تحریک کے اوّلِ لمحۂ آغاز کے ساتھ شروع ہوا اور آخری لمحات تک جیسے جیسے تحریک چلتی رہے یہ بھی ساتھ ساتھ حسبِ موقع و ضرورت نازل ہوتی رہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (النحل ۱۰۱ تا ۱۰۲)

جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں — اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرے — تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے کہو کہ اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کرے اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے۔

ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے سے مراد ایک حکم کے بعد دوسرا حکم بھیجنا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ

قرآن مجید کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں اور بارہا ایک ہی معاملہ میں چند سال کے وقفوں سے یکے بعد دیگرے دو دو، تین تین حکم بھیجے گئے ہیں۔ مثلاً شراب کا معاملہ، یا زنا کی سزا کا معاملہ۔ لیکن ہم کو یہ معنی لینے میں اس بنا پر تأمل ہے کہ سورۂ نحل کی یہ آیت مکّی دَور میں نازل ہوئی ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُس دَور میں تدریج فی الاحکام کی کوئی مثال پیش نہیں آئی تھی اس لیے ہم یہاں "ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے مختلف مقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لیے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصّہ بار بار آیا ہے اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملہ کا کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اُسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک بات ایک وقت میں مُجمل طور پر کہی گئی ہے اور دوسرے وقت میں مفصّل۔ یہی چیز تھی جسے کُفّارِ مکّہ اس بات کی دلیل ٹھیراتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، معاذ اللہ، یہ قرآن خود تصنیف کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر اس کلام کا مَنبَع علمِ الٰہی ہوتا تو پوری بات بیک وقت کہہ دی جاتی۔ اللہ کسی انسان کی طرح ناقص العلم تھوڑا ہی ہے کہ سوچ سوچ کر بات کرے، رفتہ رفتہ معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک بات ٹھیک بیٹھتی نظر نہ آئے تو دوسرے طریقہ سے بات کرے۔ یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں جو تمہارے اس کلام میں نظر آرہی ہیں۔

اس کے جواب میں پہلے بیان کیا گیا کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے "روح القدس" لے کر آرہی ہے — "روح القدس" کا لفظی ترجمہ "پاک روح" یا "پاکیزگی کی روح" ہے، اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریل کو دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ (سورۂ شعراء میں) انہی کے لیے روح الامین کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی امانت دار روح۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے سامعین کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کلام کو ایک ایسی روح لے کر آرہی ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائن ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے کچھ اور بنا دے، نہ کذّاب و مُفتری ہے کہ خود کوئی بات گھڑ کے اللہ کے نام سے بیان کر دے۔ نہ بدنیّت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس و مطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لا کر پہنچاتی ہے۔

پھر بتایا گیا کہ اُس کے بتدریج اس کلام کو لے کر آنے اور بیک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علم و دانش میں کوئی نقص ہے، جیسا کہ تم نے اپنی نادانی سے سمجھا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوتِ فہم اور قوتِ اخذ میں نقص ہے جس کے سبب سے وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک وقت کی سمجھی

ہوئی بات میں پختہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ روح القدس اس کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے لائے، کبھی اجمال سے کام لے اور کبھی اُسی بات کی تفصیل بتائے، کبھی ایک طریقہ سے بات سمجھائے اور کبھی دوسرے طریقے سے، کبھی ایک پیرایۂ بیان اختیار کرے اور کبھی دوسرا، اور ایک ہی بات کو بار بار طریقے طریقے سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرے، تاکہ مختلف قابلیتوں اور استعدادوں کے طالبینِ حق ایمان لا سکیں اور ایمان لانے کے بعد علم و یقین اور فہم و ادراک میں پختہ ہو سکیں۔

اس تدریج کی دوسری مصلحت یہ بتائی گئی کہ جو لوگ ایمان لا کر فرمانبرداری کی راہ چل رہے ہیں ان کو دعوتِ اسلامی کے کام میں اور زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں جس موقع پر جس قسم کی ہدایات درکار ہوں وہ بروقت دے دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ نہ انہیں قبل از وقت بھیجنا مناسب ہو سکتا ہے، اور نہ بیک وقت ساری ہدایات دے دینا مفید ہے۔

تیسری مصلحت یہ بتائی گئی کہ فرماں برداروں کو جن مزاحمتوں اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آرہا ہے اور جس جس طرح انہیں ستایا اور تنگ کیا جا رہا ہے، اور دعوتِ اسلامی کی راہ میں مشکلات کے جو پہاڑ سدِّ راہ ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے وہ بار بار اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی جاتی رہے اور ان کو آخری نتائج کی کامیابی کا یقین دلایا جاتا رہے تاکہ وہ پُر اُمید رہیں اور دل شکستہ نہ ہونے پائیں۔

یہ الزام کہ کچھ دوسرے لوگ قرآن تصنیف کر کے حضورؐ کو دے رہے ہیں | پچھلے الزام کے بالکل برعکس کفارِ مکہ ایک دوسرا الزام یہ لگاتے تھے کہ حضورؐ کو اس قرآن کی تصنیف کرنے میں کچھ دوسرے لوگ مدد دے رہے ہیں اور پرانے زمانے کی لکھی ہوئی چیزیں نقل کروا کر آپ اُن سے سُنا کرتے ہیں، اور یہ کام شب و روز ہو رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ	جن لوگوں نے (نبیؐ کی بات) ماننے سے انکار کر دیا
اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ	ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) ایک من گھڑت چیز ہے جسے
عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ، فَقَدْ	اِس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے
جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا - وَقَالُوْٓا	اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا	ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ پرانے لوگوں
فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ	کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کرواتا ہے اور
اَصِيْلًا - قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ	وہ اسے صبح و شام سُنائی جاتی ہیں۔ (اے محمدؐ) ان سے کہو کہ

اِذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ	کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ اُن
عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ	کا حال تو ایسا ہے جیسے اُن کو دُور سے
مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝ (حٰمٓ السجدہ ۴۴)	پکارا جا رہا ہو۔

یہ اُس ہٹ دھرمی کا ایک اور نمونہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب ہیں، عربی اُن کی مادری زبان ہے، وہ اگر عربی میں قرآن پیش کرتے ہیں تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کلام اُنھوں نے خود نہیں گھڑ لیا ہے بلکہ ان پر خدا نے نازل کیا ہے۔ اُن کے اِس کلام کو خدا کا نازل کیا ہوا کلام تو اس وقت مانا جا سکتا تھا جب یہ کسی ایسی زبان میں یکایک دھواں دھار تقریر کرنا شروع کر دیتے جسے یہ نہیں جانتے، مثلاً فارسی یا رُومی یا یونانی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب اِن کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا گیا ہے جسے یہ سمجھ سکیں تو اِن کو یہ اعتراض ہے کہ عرب کے ذریعہ سے عربوں کے لیے عربی زبان میں یہ کلام کیوں نازل کیا گیا؟ لیکن اگر کسی دوسری زبان میں یہ بھیجا جاتا تو اُس وقت یہی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ معاملہ بھی خوب ہے، عرب قوم میں ایک عرب کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مگر کلام اُس پر ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے نہ رسول سمجھتا ہے نہ قوم۔

اِس طرح اُن کے اس لغو اعتراض کو رد کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں یہ بھی سمجھایا گیا کہ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اُس نے تمہاری اپنی زبان میں ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور یہ جان سکتے ہو کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اس سے منہ موڑ کر تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو۔

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝	یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ
كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا	چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول
عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝	کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ	لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے
اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝	والا۔ مگر اِن لوگوں میں سے اکثر نے اس سے رُوگردانی
(حٰمٓ السجدہ - ۲ تا ۴)	کی اور وہ سُن کر نہیں دیتے۔

اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ یعنی تم جب تک چاہو یہ رٹ لگاتے رہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر رہے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کلام کا نزول

خداوندِ عالم کی طرف سے ہے۔ مزید برآں یہ ارشاد فرما کر مخاطبین کو اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اگر اس کلام کو سُن کر چیں بجبیں ہوتے ہو تو تمہارا یہ غصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہے، اگر اسے رَد کرتے ہو تو ایک انسان کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات رَد کرتے ہو، اور اگر اس سے بے رُخی برتتے ہو تو ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے منہ موڑتے ہو۔

دوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ اس کا نازل کرنے والا وہ خدا ہے جو اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان (رحمٰن اور رحیم) ہے۔ نازل کرنے والے خدا کی دوسری صفات کے بجائے اُس کی صفتِ رحمت کا ذکر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اُس نے اپنی رحیمی کے اقتضاء سے یہ کلام نازل کیا ہے۔ اِس سے مخاطبین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اس کلام سے اگر کوئی بے رُخی برتتا ہے، یا اسے رَد کرتا ہے، یا اس پر چیں بجبیں ہوتا ہے تو درحقیقت اپنے آپ سے دشمنی کرتا ہے۔ یہ تو ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو خدا نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی اور فلاح وسعادت کے لیے نازل کی ہے۔ خدا اگر انسان سے بے رُخی برتتا تو انہیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور کچھ پروانہ کرتا کہ یہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں۔ لیکن یہ اس کا فضل وکرم ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ اُن کی زندگی سنوارنے کے لیے علم کی روشنی دکھانا بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر یہ کلام وہ اپنے ایک بندے پر نازل کر رہا ہے۔ اب اُس شخص سے بڑھ کر ناشکرا اور آپ اپنا دشمن کون ہوگا جو اس رحمت سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے اُلٹا اس سے لڑنے کے لیے دوڑے۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اس کتاب کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ یعنی اس میں کوئی بات گنجلک اور پیچیدہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس بنا پر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر سکے کہ اس کی سمجھ میں اس کتاب کے مضامین آتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، صحیح عقائد کون سے ہیں اور غلط عقائد کون سے، اچھے اخلاق کیا ہیں اور بُرے اخلاق کیا، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، کس طریقے کی پیروی میں انسان کی بھلائی ہے اور کس طریقے کو اختیار کرنے میں اُس کا اپنا خسارہ ہے۔ ایسی صاف اور کھُلی ہوئی ہدایت کو اگر کوئی شخص رَد کرتا ہے یا اُس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا۔ اُس کے اِس رویّے کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود بر سرِ غلط رہنا چاہتا ہے۔

چوتھی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ عربی زبان کا قرآن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی غیر زبان میں آتا تو اہلِ عرب یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ہم اُس زبان ہی سے نابلد ہیں جس میں خدا نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔

لیکن یہ تو ان کی اپنی زبان میں ہے۔ اسے نہ سمجھ سکنے کا بہانا یہ نہیں بنا سکتے۔

پانچویں بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں۔ یعنی اس سے فائدہ صرف دانا لوگ ہی اُٹھا سکتے ہیں، نادان لوگوں کے لیے یہ اُسی طرح بے فائدہ ہے جس طرح ایک قیمتی ہیرا اُس شخص کے لیے بے فائدہ ہے جو ہیرے اور پتھر کا فرق نہ جانتا ہو۔

چھٹی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب بشارت دینے والی اور ڈرا دینے والی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ محض ایک تخیّل، ایک فلسفہ اور ایک نمونۂ انشاء پیش کرتی ہو جسے ماننے یا نہ ماننے کا کچھ حاصل نہ ہو۔ بلکہ یہ ہانکے پکارے تمام دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اسے ماننے کے نتائج نہایت شاندار اور نہ ماننے کے نتائج انتہائی ہولناک ہیں۔ ایسی کتاب کو صرف ایک بیوقوف ہی سرسری طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔

قرآن کی دعوت کو روکنے کے لیے کفار کی تدبیریں ان سب حربوں میں ناکام ہونے کے بعد ان کا آخری حربہ یہ تھا کہ کھُلی کھُلی ہٹ دھرمی پر اُتر آئیں، قرآن کی دعوت کو زبردستی روکنے کی کوشش کریں، اور جب قرآن سُنایا جانے لگے تو خوب شور مچائیں اور ہر طرف سے اس کا مذاق اُڑانے اور اس پر آوازے کسنے کے لیے ٹوٹ پڑیں۔ قرآن کریم میں ان کی یہ سب حرکات ایک ایک کر کے بیان کر دی گئیں جن سے ہر معقول آدمی کو معلوم ہو گیا کہ کفار کے پاس اب دلیل کے جواب میں دلیل نہیں ہے بلکہ اس میدان میں شکست کھا کر اب وہ زور، زبردستی اور بیہودگی سے حق کی آواز کو دبانے پر اُتر آئے ہیں۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ۔ (حٰم السجدہ ۔ ۵)	اور انہوں نے کہہ دیا کہ جس چیز کی طرف تو ہمیں بُلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں (یعنی ہمارے دلوں تک اس کے پہنچنے کا کوئی راستہ کھُلا ہوا نہیں ہے)، ہمارے کانوں میں گرانی ہے، (یعنی ہم اسے نہیں سُنتے)، اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے (یعنی جدائی پڑ گئی ہے) پس تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کر رہے ہیں (یعنی تیری مخالفت میں سرگرم ہیں)۔
وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا	جب یہ کافر لوگ کلامِ نصیحت (قرآن) سُنتے ہیں تو

لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۝ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (القلم - ۵۱-۵۲)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ (اپنی غضبناک) نظروں سے تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو مجنون ہے۔ حالانکہ یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (حٰمٓ السجدہ - ۲۶)

اور یہ منکرین حق کہتے ہیں کہ اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور شور مچا کر اس میں خلل ڈالو شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ۔

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ (المعارج ۳۶-۳۷)

پس (اے نبیؐ) کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے تمہاری طرف دوڑے چلے آرہے ہیں؟

"یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مذاق اڑانے اور آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے"۔

فصل چہارم

آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا چوتھا نکتہ یہ تھا کہ لوگ آخرت پر ایمان لائیں۔ یہ ایک محض مختصر سا نکتہ نہ تھا بلکہ اس میں بہت سی اہم حقیقتیں شامل تھیں جنہیں تسلیم کرنے کا مجموعی نام ایمان بالآخرۃ تھا۔

اوّل یہ کہ دنیا میں انسان غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ یہاں جو کچھ بھی وہ چاہے کرتا رہے، کوئی اُس سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ بلکہ یہ دُنیا دارالامتحان ہے جس میں انسان آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے، اور جو کچھ بھی وہ یہاں کرتا ہے اس کی جواب دہی اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے کرنی ہوگی۔

دوم یہ کہ اس جواب دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ نوع انسانی کو دنیا میں کام کرنے کے لیے جتنی مہلت دینے کا اللہ فیصلہ فرما چکا ہے، اس کے ختم ہونے پر قیامت برپا ہوگی جس میں یہ سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظامِ عالم قائم کیا جائے گا اور ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جتنے انسان گذر چکے ہوں گے وہ سب بیک وقت زندہ کر کے از سرِ نو اُس عالم میں اُٹھائے جائیں گے۔ یہ دوسری زندگی دنیا کی موجودہ زندگی کی طرح عارضی نہیں بلکہ ابدی ہوگی۔ موت اس میں کبھی نہ آئے گی۔

سوم یہ کہ اُس وقت تمام اگلے پچھلے انسانوں کو جمع کر کے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں اُن اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی جو اُس نے خود اپنی ذمہ داری پر دُنیا میں کیے ہوں گے۔

چہارم یہ کہ دنیا میں انسان جو کچھ بھی کر رہا ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ اس کو خود براہ راست جانتا ہے، مگر عدل کی تمام شرائط پوری کرنے کے لیے وہ اُس کا مکمل اور بالکل صحیح نامۂ اعمال تیار کرا رہا ہے۔ بے شمار شہادتیں اس کے ایک ایک قول و فعل کے لیے فراہم کر رہا ہے خواہ وہ اس نے علانیہ کیا ہو یا چھُپ کر۔ بلکہ جس نیّت اور جس ارادے سے اس نے کوئی بات کی یا کہی ہے اور جو جو خیالات اُس نے اپنے دل میں رکھے ہیں، ان سب کا ثبوت بھی وہ محفوظ کرتا جا رہا ہے۔ پھر اس بات کے گواہ بھی اُس نے تیار کر رکھے ہیں کہ انسان کو حق اور باطل کا فرق سمجھانے اور غلط راستوں کے درمیان سیدھا راستہ بتانے کے لیے اُس کی طرف سے پورا انتظام کر دیا گیا تھا۔ یہ سب شہادتیں اللہ کی عدالت میں اس شان سے پیش ہوں گی کہ انسان ان کا انکار نہ کر سکے گا۔

پنجم یہ کہ اللہ کی عدالت میں کوئی رشوت، بے جا سفارش، اور خلافِ حق وکالت نہ چل سکے گی۔ کسی کا بوجھ کبھی دوسرے پر ڈالا جائے گا اور نہ کوئی عزیز سے عزیز اور قریب سے قریب شخص اپنے عزیز و قریب کا بوجھ اپنے اُوپر لے گا۔ جن واقعی یا خیالی ہستیوں کو آدمی اپنا ولی و ناصر سمجھتا ہے وہ اس کے کسی کام نہ آئیں گی۔ انسان وہاں تنِ تنہا بالکل بے یار و مددگار کھڑا ہوا اپنے کارنامۂ حیات کا حساب آپ دے رہا ہوگا۔ اور فیصلہ بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

ششم یہ کہ فیصلے کا مدار کلیتہً اِس بات پر ہوگا کہ انسان نے دنیا میں انبیاء کے بتائے ہوئے حق کو مان کر اس کے مطابق اللہ کی ٹھیک ٹھیک بندگی کی یا نہیں، اور آخرت میں اپنی جواب دہی کے احساس کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی بسر کی یا اسے بھول کر سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا رہا۔ پہلی صورت میں اس کے لیے جنت ہے اور دوسری صورت میں جہنم۔

یہ آخرت کا عقیدہ اسلامی دعوت کے لیے اُتنا ہی اہم ہے جتنا توحید، رسالت اور قرآن کو کلام الٰہی ماننے کا عقیدہ ہے۔ کیونکہ اسلام جس طرزِ فکر و عمل کی طرف بلاتا ہے اور جس راہ پر چلنے کی دعوت دیتا ہے اس پر ایک قدم بھی انسان نہیں چل سکتا جب تک دُنیا کو امتحان گاہ اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ نہ سمجھ لے۔ اور جب تک اُس کے دماغ سے یہ خیال نکل نہ جائے کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں ظاہر ہونے والے نتائج ہی خیر و شر کا اصل معیار ہیں، اور وہ سچے دل سے یہ بات نہ مان لے کہ اصلی اور ابدی زندگی وہ ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے، اور خیر و شر کا حقیقی معیار یہ ہے کہ کس راہ پر چل کر آدمی اُس دوسری زندگی میں کامیاب ہوگا اور کس پر چل کر بُرا انجام دیکھے گا۔ یہ عقیدہ نہ ہو تو آدمی سرے سے توحید و رسالت اور ایمان بالقرآن کی دعوت کو قابلِ اعتنا ہی نہ سمجھے گا، اور اگر کسی وجہ سے اس کو مان بھی لے تو خدا کی بندگی، رسول کی اطاعت اور قرآن کی پیروی میں ہرگز سنجیدہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جب آدمی یہ سمجھتا ہو کہ آخر کار سب کو مر کر مٹی میں مل جانا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی پیروی کرنے کی جزا اور نہ کرنے کی سزا لازماً ملنے والی ہو تو وہ کبھی ایمانداری کے ساتھ اپنے آپ کو اُس ضابطہ میں بندھوا دینے کے لیے تیار نہ ہوگا جس میں اسلام اس کو باندھنا چاہتا ہے، بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں وہ طریقہ اختیار کرے گا جس سے دنیا میں کچھ فائدہ، کچھ لطف اور کچھ لذت حاصل ہو، اور ہر اُس طریقے سے اجتناب کرے گا جس کی بدولت وہ حیاتِ دنیا کے فائدوں اور لذتوں سے محروم ہوتا ہو یا نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہوتا ہو۔

قریش کا آخرت کو بعید از عقل اور ناممکن سمجھنا اس عقیدے کی یہی اہمیت تھی جس کی وجہ سے قریش اور مشرکینِ عرب کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسے پیش کیا تو وہ سب سے زیادہ اسی پر چونکتے ہوئے۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ اگر اس کو ہم مان لیں تو ہماری ساری آزادیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہم تنہائی میں بھی، جہاں ہمیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، کوئی ایسا فعل جسے خدا اور رسول اور قرآن نے حرام کیا ہے نہ کر سکیں گے۔ ہم جہاں کوئی ناجائز فائدہ یا لطف یا لذت حاصل کرنے پر پوری طرح قادر ہوں گے وہاں بھی یہ عقیدہ ہمارے ہاتھ باندھ کر رکھ دے گا۔ یہ تو ایک غیر محسوس سپاہی ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ لگا دے گا جو کسی حالت میں بھی ہم کو من مانی نہ کرنے دیگا۔ اِسی بنا پر وہ پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو گئے، اور انہوں نے بڑے زور شور سے لوگوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات تو قطعی خلافِ عقل ہے، بعید از امکان، سراسر دیوانگی، بلکہ محض قابلِ مضحکہ ہے۔

قرآن مجید میں اُن کے اِن خیالات کو جگہ جگہ نقل کر کے بڑے معقول دلائل کے ساتھ سب سے پہلے آخرت کا امکان ثابت کیا گیا، کیونکہ بعد کی کوئی بات انسان کے ذہن میں اُتر نہیں سکتی تھی جب تک پہلے آخرت کو ممکن ثابت کر کے اس کے عدمِ امکان کے واہمہ کا قلع قمع نہ کر دیا جائے۔

منکرین آخرت کے خیالات کفار میں سے ایک قلیل گروہ ایسا بھی تھا جو کہتا تھا کہ ہم گمان کی حد تک تو سمجھتے ہیں کہ شاید آخرت ہو مگر ہمیں اس کا یقین نہیں ہے۔ اِس گروہ کا ذکر صرف ایک جگہ قرآن میں آیا ہے، ورنہ ہر جگہ قطعی انکار کرنے والوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس خیال کے لوگ بہت کم پائے جاتے تھے۔

پہلے گروہ کا ذکر احوالِ آخرت کے بیان میں صرف اِس جگہ آیا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (الجاثیہ - ۳۲)	اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو تم کہتے تھے کہ "ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہوتی ہے؟ ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں ہے۔"

بظاہر ان دونوں گروہوں میں اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ ایک آخرت کا بالکل منکر ہے اور دوسرا اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار اور اس پر یقین نہ ہونے کے اخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا صرف گمان رکھتا ہو اور یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کے احساس سے خالی ہوگا اور یہ عدمِ احساس اس کو لازماً فکر و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا کر کے رہے گا۔ صرف آخرت کا یقین ہی دنیا میں آدمی کے رویّے کو درست رکھ سکتا ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو شک اور انکار، دونوں اسے ایک ہی طرح کی غیر ذمہ دارانہ روش پر ڈال دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہی غیر ذمہ دارانہ روش آخرت کی بدانجامی کا اصل سبب ہے، اس لیے دوزخ میں جانے سے نہ انکار کرنے والا بچ سکتا ہے، نہ یقین نہ رکھنے والا۔

اِس ایک مقام کو چھوڑ کر باقی تمام مقامات پر قرآن میں آخرت کا کھلا کھلا انکار کرنے والوں کے اقوال نقل کیے گئے ہیں:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	یہ لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی

نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۔ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّوْنَ ۔ وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الجاثیہ ۲۴ تا ۲۵)

زندگی ہے ۔ یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔" درحقیقت اِس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے ۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات (جو آخرت پر دلالت کرتی ہیں) انہیں سُنائی جاتی ہیں تو اِن کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اُٹھالاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔

یعنی کوئی ذریعۂ علم ایسا نہیں ہے جس سے ان کو بتحقیق یہ معلوم ہوگیا ہو کہ اِس زندگی کے بعد انسان کے لیے کوئی دوسری زندگی نہیں ہے ۔ اور یہ بات بھی انہیں معلوم ہوگئی ہو کہ انسان کی روح کسی خدا کے حکم سے قبض نہیں کی جاتی بلکہ آدمی محض گردشِ ایام سے مر کر فنا ہو جاتا ہے ۔ منکرینِ آخرت یہ باتیں کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ محض گمان کی بنا پر کرتے ہیں ۔ علمی حیثیت سے اگر وہ بات کریں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں"۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم جانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے"۔ اِسی طرح علمی طریقہ پر وہ یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آدمی کی رُوح خدا کے حکم سے نکالی نہیں جاتی ہے بلکہ وہ محض اُس طرح مر کر ختم ہو جاتا ہے جیسے ایک گھڑی چلتے چلتے رُک جائے ۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ "ہم ان دونوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ فی الواقع کیا صورت پیش آتی ہے"۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انسانی ذرائعِ علم کی حد تک زندگی بعدِ موت کے ہونے یا نہ ہونے ، اور قبضِ روح واقع ہونے یا گردشِ ایام سے آپ ہی آپ مر جانے کا یکساں احتمال ہے ، تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ امکانِ آخرت کے احتمال کو چھوڑ کر حتمی طور پر انکارِ آخرت کے حق میں فیصلہ کر ڈالتے ہیں ؟ کیا اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ اور ہے کہ در اصل مسئلے کا آخری فیصلہ وہ دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی خواہشات کی بنا پر کرتے ہیں ؟ چونکہ اُن کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہو اور موت کی حقیقت نیستی اور عدم نہیں ، بلکہ خدا کی طرف سے قبضِ روح ہو ، اس لیے وہ اپنے دل کی مانگ کو اپنا عقیدہ بنا لیتے ہیں اور دوسری بات کا انکار کر دیتے ہیں ۔

قَالُوْٓا ءَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا

یہ کہتے ہیں "کیا جب ہم کر مٹی ہو جائیں گے اور

وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے۔ تو ہم کو پھر زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سُنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سُنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہ ہائے پارینہ ہیں۔

(المومنون - ۸۲-۸۳)

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرَابًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۔ (الرعد - ۵)

اور اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے"؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔

یعنی ان کا آخرت سے انکار اور اسے بعید از امکان سمجھنا دراصل خدا سے اور اس کی قدرت اور حکمت سے انکار ہے۔ یہ صرف اتنا ہی نہیں کہتے کہ ہمارا مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہونا غیر ممکن ہے، بلکہ ان کے اِسی قول میں یہ خیال بھی پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ وہ خدا عاجز و درماندہ اور نادان و بے خرد ہے جس نے اِن کو پیدا کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ اَفْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۔

منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرّہ ذرّہ منتشر ہو چکا ہوگا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اِسے جنون لاحق ہے"۔

(سبا - ۷-۸)

قریش کے سردار قطعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا کہہ دینے کی ہمت نہ رکھتے تھے کیونکہ پوری قوم آپ کو صادق القول جانتی تھی اور کبھی ساری عمر کسی نے آپ کی زبان سے کوئی جھوٹی بات نہ سُنی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے سامنے اپنا الزام اس شکل میں پیش کرتے تھے کہ یہ شخص جب زندگی کے بعد موت جیسی ان ہونی بات زبان سے نکالتا ہے تو لامحالہ اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو (معاذ اللہ) یہ شخص جان بوجھ

کر ایک جھوٹی بات کہہ رہا ہے، یا پھر یہ مجنون ہے۔ لیکن یہ مجنون والی بات بھی اُتنی ہی بے سر و پا تھی جتنی جھوٹے والی بات۔ اس لیے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی ایک کمال درجہ کے عاقل و فہیم آدمی کو مجنون مان سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس بیہودہ بات کے جواب میں کسی استدلال کی ضرورت محسوس نہ فرمائی اور کلام صرف اُن کے اُس اچنبھے پر کیا جو زندگی بعد موت کے امکان پر وہ ظاہر کرتے تھے۔

يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ (النّٰزعٰت - ۱۰-۱۲)

یہ لوگ کہتے ہیں "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے جائیں گے؟ کیا جب ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے؟" کہنے لگے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہوگی۔"

یعنی جب اُن کو جواب دیا گیا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا تو وہ مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یار واقعی ہمیں پلٹ کر دوبارہ زندگی کی حالت میں واپس آنا پڑا تو ہم مارے گئے، اس کے بعد تو پھر ہماری خیر نہیں۔

وَكَانُوا يَقُولُونَ ۝ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۝ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۝ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ لَمَجْمُوعُونَ ۝ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۝ (الواقعہ - ۴۷ تا ۵۰)

اور وہ کہتے تھے "کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کے پنجر بن کر رہ جائیں گے تو پھر اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اُٹھائے جائیں گے جو پہلے گذر چکے ہیں؟" (اے نبیؐ) اِن لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔

(باقی)